يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (5:67)

اے رسُولؐ! اِس ضابطہ حیات کو جو تمہارے ربّ کی طرف سے تُم پر نازل کیا گیا ہے تمام اِنسانوں تک پہنچا دو۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (3:85)

اسلام کیا ہے؟

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

ادارہ طلوعِ اسلام

25-B، گلبرگ 2، لاہور فون: 042-35714546

Email: idara@toluislam.com

Web: www.toluislam.com

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لئے

ماھنامہ

طلوعِ اسلام

خود پڑھیئے،

دُوسروں کو پڑھنے کے لیے پیش کیجیے

یہ

ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے جس کا مقصد قرآنی فِکر کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوانوں کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے

صحیح آسمانی اِنقلاب بن کر اُبھرے!

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

سالانہ زرشرکت اندرون ملک -/450 روپے۔ بیرون ملک -/2500 روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ

بنام ادارہ طلوع اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور ارسال فرمائیں۔

بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465

نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور۔

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
صرف ایک سوال	2
اسلام اور علمائے کرام	11
اسلام کیا ہے؟	22

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صرف ایک سوال

یہ شکایت آج کی نہیں، صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔۔ کسی خاص فرقہ۔خاص گروہ۔خاص ملک کے مسلمانوں نے نہیں۔ پوری کی پوری اُمتِ مسلمہ نے۔ بات ہے تو درست، لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی کسی نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کیا ہوا کہ پوری کی پوری قوم نے اسلام چھوڑ دیا۔اور یہ ایک آدھ دن کی بات نہیں۔صدیوں سے اس کی یہی حالت ہے۔تو ایسا کیوں ہے؟ ایک بات تو بالکل واضح ہے۔۔ پہلے اسی پر غور کرنا چاہئے۔

آپ کسی کمیونسٹ سے پوچھئے کہ کمیونزم کسے کہتے ہیں۔ وہ صاف، واضح اور متعین الفاظ میں اس کا جواب دے دے گا۔۔۔ آپ یہ سوال متعدد کمیونسٹوں سے پوچھئے۔ ہر ایک کا جواب ایک ہی ہوگا۔اس جواب کی روشنی میں آپ کے لئے یہ متعین کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا کہ فلاں شخص کمیونسٹ ہے یا نہیں۔ یا فلاں قوم نے کمیونزم کو چھوڑ دیا ہے یا وہ اس پر عمل پیرا ہے۔

اسی طرح آپ سوشلسٹوں سے، سوشلزم کے متعلق پوچھئے ان کے ہاں سے بھی متعین جواب مل جائے گا کہ سوشلزم کسے کہتے ہیں اور اس کے جواب کی روشنی میں آپ بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ فلاں شخص یا قوم نے سوشلزم کو چھوڑ دیا ہے یا نہیں؟

اس قسم کا سوال آپ مغربی جمہوریت کے متعلق پوچھئے۔ وہاں سے بھی آپ کو متعین جواب مل جائے گا۔

اس کے بعد آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ اسلام کیا ہے اور پھر دیکھئے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے، اور جب آپ یہی سوال مختلف مسلمانوں سے پوچھیں تو اس کے بعد دیکھئے کہ ان میں سے ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔ یہ بات ہم عوام کے متعلق نہیں کر رہے۔ حضرات علماء کرام سے یہ سوال کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان کے ہاں سے کیا جواب ملتا ہے اور ایک کا جواب دوسرے

سے کس قدر مختلف ہوتا ہے۔ ہم یہ بات محض نظری طور پر نہیں کہہ رہے۔ عملاً ایسا ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے (ختمِ نبوت تحریک کے سلسلہ میں) فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے (جسے عرفِ عام میں منیر کمیٹی کہا جاتا ہے) مختلف علماء کرام سے پوچھا کہ ''مسلمان کسے کہتے ہیں'' کمیٹی کی رپورٹ مطبوعہ شکل میں موجود ہے اس میں آپ دیکھئے کہ ان حضرات کی طرف سے اس سوال کا جواب کیا ملا تھا! ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا کہ اس سوال کا جواب دو چار فقروں میں دیا نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے صفحات درصفحات درکار ہوں گے۔ جنہوں نے جواب دیا۔ ان کے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:۔

ان علماء میں سے کسی دو کے جواب بھی ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے۔

(انگریزی رپورٹ۔ص ۲۱۸)۔

آپ اس رپورٹ پر نہ جایئے۔ مختلف فرقوں کے علماء حضرات سے خود یہ سوال پوچھئے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی تعریف (Definition) کیا ہے۔ ان کے جواب خود اس رپورٹ کی تائید کر دیں گے۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے' تو اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ جب ہم متعین اور متفق طور پر یہی نہیں بتا سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے تو ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہوگا کہ ''مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے۔'' یہ وجہ ہے جو ہم صدیوں سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے اور مسلمان ہیں کہ اسلام کو اختیار کرنے کا سوچتے تک نہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں پتہ ہی نہیں کہ انہوں نے کیا چھوڑ دیا ہے اور انہیں کیا اختیار کرنا چاہیئے۔ ہم اتنا واضح کر دیں کہ مختلف فرقے اپنے اپنے فرقہ کے تصور کا اسلام تو بتا دیں گے۔ لیکن وہ اسلام جو ساری امت میں قدر مشترک ہے' جس کی طرف نسبت سے وہ امت' امت مسلمہ کہلاتی ہے اور جس کے متعلق شکایت ہے کہ اس نے اسے چھوڑ دیا ہے' اس کی بابت کوئی کچھ نہیں بتا سکے گا کہ وہ ہے کیا؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر اور تو اور' آپ خود بھی وقفِ تعجب ہو جائیں گے کہ جس بات کے متعلق کبھی ہم نے اتنا سوچنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ یہ بھی ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا

چاہئے، وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی نکلی۔ اس کے بعد آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم تو خیر عامی ہیں۔ دین کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں، اس لئے ہم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھی اس سوال کا متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ اور جب ان کی یہ کیفیت ہے تو پھر وہ امت میں اپنی موجودہ پوزیشن کو کس طرح قائم رکھے ہوئے ہیں اور لوگوں کو اسلام کے متعلق مطمئن کس طرح کر دیتے ہیں؟

اس کی ایک خاص ٹیکنیک ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے کچھ اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جن کا تقدس عوام کے دلوں میں راسخ کر دیتے ہیں۔ ان اصطلاحات کو مبہم رکھا جاتا ہے۔ یعنی ان کا واضح مفہوم بیان نہیں کیا جاتا۔ ہر موقع پر اس اصطلاح کو استعمال کر دیتے ہیں اور بس۔۔ مثلاً ان میں بنیادی اصطلاح خود اسلام ہے۔ آپ آئے دن ان حضرات کی زبانی اس قسم کے الفاظ سنتے رہتے ہیں کہ ''اسلام کا حکم یہ ہے'' اس معاملہ میں ''اسلام کا منشاء یہ ہے''۔ اس باب میں ''اسلام یہ کہتا ہے۔'' اب ظاہر ہے کہ ''اسلام'' کسی شخص کا نام نہیں جس کے متعلق سمجھا جا سکے کہ وہ ایسا کہتا ہے یا اس کا حکم یہ ہے۔ اس کے لئے کوئی سند یا حوالہ ہونا چاہئے جہاں سے معلوم ہو سکے کہ کون ایسا کہتا ہے۔ یہ کس کا حکم ہے۔ لیکن یہ حضرات کبھی حوالہ نہیں دیں گے، اسے ہمیشہ مبہم رکھیں گے۔ اس لئے کہ جب یہ کہیں گے کہ ''اسلام کا یہ فیصلہ ہے'' تو اکثر و بیشتر یہ فیصلہ ان کا اپنا ہوگا جسے یہ اسلام کا فیصلہ کہہ کر پیش کر دیں گے اور یا ان کے فرقہ کا فیصلہ۔ اب ظاہر ہے کہ کسی فرقہ کا فیصلہ تو اسلام کا فیصلہ نہیں کہلا سکتا۔ لیکن یہ اسے دانستہ مبہم رکھیں گے۔

اس قسم کی ایک اصطلاح ہے ''اسلامی شریعت'' یا ''شریعتِ حقہ''۔ آئے دن اس قسم کے الفاظ سننے میں آتے ہیں کہ شریعت کا یہ حکم ہے۔ شریعت کا یہ فیصلہ ہے۔ یہ از روئے شریعت ناجائز ہے۔ آپ دل میں سمجھتے ہوں گے کہ یہ اسلام کا فیصلہ ہے۔ لیکن یہ بھی درحقیقت کسی فرقہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر فرقہ کی شریعت الگ الگ ہے۔ جسے آپ ''اسلام کی شریعت'' کہیں گے۔۔۔ یعنی وہ شریعت جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں، اس کا کہیں وجود نہیں۔

ایک اصطلاح ''سنتِ رسول اللہؐ'' ہے۔ اس کے متعلق تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ تمام

مسلمانوں میں متفقہ علیہ ہوگی کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تو ایک ہی تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ایک ہی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں۔ سنت رسولؐ اللہ بھی ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔ حتیٰ کہ ''سنت'' کی تعریف (Definition) تک بھی مختلف۔

یہ (اور اسی قسم کی کئی ایک اور) اصطلاحات ہمارے ہاں صدیوں سے رائج چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں چونکہ سیاست کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس لئے اب قدیم اصطلاحات کے بجائے، جن کا تعلق ''مذہب'' سے سمجھا جاتا ہے، نئی نئی اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں۔ ان میں ایک اصطلاح ''اقامتِ دین'' ہے۔ اس اصطلاح کی پبلسٹی تو بہت زیادہ ہوتی ہے، لیکن اسکا متعین مفہوم آج تک نہیں بتایا گیا۔ اگر اس اصطلاح کے مدعی اس کا مفہوم واضح کر دیں تو مختلف فرقوں کے علماء شور مچا دیں کہ جسے تم دین کہتے ہو، وہ دین ہے ہی نہیں۔ لہٰذا، ان حضرات نے بھی اسی میں خیریت سمجھ رکھی ہے کہ اس اصطلاح کو مبہم رکھا جائے۔

اب ''دین'' کے بجائے نظام کا لفظ زیادہ پاپولر ہو رہا ہے۔ اسکی بنا پر ایک اصطلاح ''اسلامی نظام'' ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں خود اسلام کا مفہوم ہی متعین نہیں، اس لئے ''اسلامی نظام'' کی اصطلاح بھی شرمندۂ معنی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی سیاست میں جس مقصد کے لئے سلوگن وضع اور اختیار کئے جاتے ہیں اس مقصد کے لئے ہمارے ہاں کے مذہبی طبقہ میں اس قسم کی اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ سلوگن سے مراد ہوتی ہے ایسے الفاظ جن کا مفہوم متعین نہ ہو لیکن جنہیں عوام میں پاپولر بنا کر فریقِ مقابل کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ زمانۂ قدیم کے عصرِ سحر (Age of Magic) میں جو کام، جنتر منتر، ٹونا ٹوٹکا سے لیا جاتا تھا، وہی کام عصرِ رواں میں سلوگن سے لیا جاتا ہے۔ جنتر منتر یا ٹونے ٹوٹکے ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتے تھے جن کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اگر تم ان الفاظ کو اس طرح اتنی مرتبہ دہراتے جاؤ گے تو تمہارا دشمن مغلوب ہو جائے گا۔ بعینہٖ یہی پوزیشن ہمارے زمانے میں سلوگن نے لے رکھی ہے اور اب یہی کام ہمارے ہاں اصطلاحات سے لے لیا جاتا ہے۔ پھر جس

طرح ایک سلوگن کچھ عرصہ کے بعد، کثرتِ استعمال سے غیر مؤثر ہو جاتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں کی اصطلاحات بھی کچھ عرصہ کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ کسی زمانے میں جو اثر، اقامتِ دین۔ حکومتِ الٰہیہ۔ اسلامی نظام وغیرہ قسم کی اصطلاحات پیدا کیا کرتی تھیں، اب یہ اس قسم کا اثر پیدا نہیں کرتیں۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ ایک نئی اصطلاح وضع کی جائے اور وہ اصطلاح ہے ''نظامِ مصطفیٰؐ''، چونکہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہمارے نہایت گہرے قلبی جذبات سے ہے، س لئے یہ اصطلاح، سابقہ اصطلاحات کے مقابلہ میں، عوام کے لئے زیادہ مؤثر اور پرکشش ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس اصطلاح کو بھی مبہم رکھا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ سنت رسولؐ اللہ کی طرح ہر فرقہ کا نظامِ مصطفیٰؐ کا تصور اپنا اپنا ہے۔

مختلف فرقوں کے علماء تو ایک طرف، خود حنفیوں میں بریلوی اور دیو بندی حضرات کے نزدیک اس کا مفہوم الگ الگ ہے۔ موجودہ ہنگاموں میں، بریلوی فرقہ کی نمائندگی مولانا نورانی کر رہے ہیں اور دیو بندی فرقہ کی مفتی محمود صاحب اور ان دونوں میں ''نظامِ مصطفیٰؐ''، تو ایک طرف ''مقام مصطفیٰؐ''، تک میں شدید اختلاف ہے۔ لہٰذا ان کی سیاسی مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس اصطلاح (نظامِ مصطفیٰؐ) کو مبہم رکھا جائے...... اس کا کوئی ایسا مفہوم پیش ہی نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقوں کے علماء متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کی وضاحت کا تقاضا کیا جائے تو اسے بلند آہنگ الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔۔۔ مثلاً حال ہی میں ''نوائے وقت'' میں اس عنوان پر کہ ''نظامِ مصطفیٰؐ کیا ہے''۔۔۔ دو مبسوط مقالات شائع ہوئے ہیں۔ ایک مقالہ میں کہا گیا ہے کہ نظامِ مصطفیٰؐ:۔

> اخلاقی لحاظ سے نظامِ مساوات۔۔ سیاسی لحاظ سے نظامِ حفاظت وعدل۔۔ معاشی لحاظ سے نظامِ عدل و کفالت۔۔ روحانی لحاظ سے نظام ذکر وفکر اور للّٰہیت۔۔ معاشرتی لحاظ سے نظامِ اخوت ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء)۔

دوسرے مقالہ میں کہا گیا ہے۔۔۔ نظامِ مصطفیٰؐ کیا ہے؟

> کائنات گیر علم۔۔ یزداں شعار عبادت۔۔ پاکیزہ اخلاق۔۔ عظیم سیاست۔۔ علم

خوفِ خدا کا سبب، اور خوفِ خدا دانش کی انتہا۔ (نوائے وقت ۵ اگست ۱۹۷۷ء)۔

اس قسم کے ہیں حریر واطلس کے وہ نرم و نازک پردے جن میں اس مصلحت (یا حکمت عملی) کو چھپایا جاتا ہے کہ اس نظام کا متعین مفہوم عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔۔ کیونکہ اس کی وضاحت سے اس دعویٰ کا پردہ چاک ہو جاتا ہے کہ اس مطالبہ میں تمام فرقوں کے نمائندے متفق ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔۔۔ یہ کتمانِ حقیقت کی اسی قسم کی سعیٔ ناکام ہے جس کی مثال پہلے بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں پر مشتمل اکیس علماء نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کا ضابطۂ قوانین ''کتاب وسنت'' کے مطابق مرتب کیا جائے گا اور اس کے بیس برس بعد ''متفقہ مطالبہ'' کا پردہ خود ان ہاتھوں کو، جنہوں نے یہ پردہ لٹکایا تھا، یہ کہہ کر اٹھانا پڑا کہ:

> کتاب وسنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے مختلف فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ (مودودی صاحب)

اس سے، اکتیس علماء کے اس مطالبہ کا بھانڈا پھوٹ گیا جسے وہ ۱۹۵۱ء سے متفقہ طور پر اسلامی کہہ کر پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ یہ بیس پچیس برس تو خیر، نظری بحثوں میں گذر گئے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اب یہ مطالبہ عملی شکل اختیار کر لے اور اس وقت اس اصطلاح کا متعین مفہوم سامنے لائے بغیر چارہ نہ رہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر اکتوبر ۷۷ء کے مجوزہ انتخابات کے نتیجے میں، زمامِ حکومت نظام مصطفیٰؐ کے مدعیوں کے ہاتھ میں آ گئی تو سب سے پہلا مرحلہ، پبلک لاز کا متفق علیہ ضابطہ مرتب کرنے کا درپیش ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مختلف فرقوں کے یہ نمائندے ایسا ضابطہ مرتب کر ہی نہیں سکیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا ہوگا؟

تحریک پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر استوار تھی۔ (۱) دوقومی نظریہ اور (۲) نظریۂ پاکستان یعنی اسلام کی بنیادوں پر ایک آزاد مملکت کا قیام۔ ہندو (اور ان کی ہمنوائی میں دنیا بھر کی دیگر اقوام) کہتے تھے کہ ان بنیادوں پر کوئی مملکت استوار نہیں ہوسکتی۔ وہ زمانہ لد گیا جب مذہب کی بنیاد پر سلطنتیں قائم کی جایا کرتی تھیں۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ پر ہندو، اور ان کے ہم نواؤں نے، بانگِ دہل اعلانات کئے کہ دیکھا

ناں! جو کچھ ہم کہتے تھے وہ کس طرح سچ ثابت ہوا۔ دوقومی نظریہ کس طرح ناکام رہا؟ اور اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ جس طرح دوقومی نظریہ ناکام ثابت ہوا ہے' تم دیکھو گے کہ تمہارا دوسرا نظریہ' یعنی مذہب کی بنیادوں پر مملکت کی تشکیل۔۔ بھی اسی طرح ناکام ثابت ہوگا۔

اب' جب مختلف فرقوں کے علماء پر مشتمل پارلیمان' ایک متفق علیہ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کرنے میں ناکام رہی' تو ہمارے یہی دشمن ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کریں گے کہ دیکھا! جو کچھ ہم کہتے تھے وہ بالآخر سچ ثابت ہو کر رہا یا نہیں!

یہ اسی روزِ بد کا لرزہ انگیز احساس ہے جو ہمیں ان حضرات کی خدمت میں گذارش کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ مملکت کا استحکام اور اسلام کا احیاء ہوگا' تو آپ جس قدر جلد اس غلط فہمی کو دور کر دیں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ آپ کی موجودہ روش سے مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور اسلام دنیا کی نظروں میں اضحوکہ بن جائے گا۔ اگر آپ فی الواقعہ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو پہلے یہ طے کر لیجئے کہ اگر قانون سازی کے اختیارات آپ کے ہاتھ میں آ گئے تو آپ وہ ضابطہ حیات کس طرح مرتب کریں گے جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پائے۔

اگر یہ حضرات ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں' تو ہم قوم سے بزور گذارش کریں گے کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے سلوگنوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے' ان سے مطالبہ کرے کہ وہ اس سوال کا واضح الفاظ میں جواب دیں۔

اس سوال کا جواب کچھ بھی مشکل نہیں۔ اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

(ا) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' نظام مصطفیٰ ؐ کے مدعی مختلف فرقوں سے متعلق ہیں۔ ان میں' ہر فرقہ کی فقہ (ضابطۂ قوانین) الگ الگ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک یہ حضرات اپنی اپنی فقہ کو غیر متبدل اسلامی شریعت قرار دیتے رہیں گے' کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ نے دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے لگا رکھے ہیں۔

(۲) ان سب میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ لہٰذا' ان کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کا' اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ یہ اپنی اپنی فقہ سے صرفِ نظر کر کے' قرآن مجید کو ضابطۂ قوانین کی بنیاد قرار دیں اور اسے قولِ فیصل اور حرفِ آخر تسلیم کریں۔

(۳) قرآن کریم سلوگن نہیں دیتا۔ وہ ہر بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) اس کا دعویٰ ہے۔ یعنی ہر بات کو نکھار اور ابھار کر بیان کرنے والی کتاب۔

(۴) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ دی ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82)۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اسمیں بکثرت اختلافات پاتے۔ لہٰذا قرآن مجید کو قدر مشترک تسلیم کر لینے کے بعد کوئی اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔

(۵) الدین۔ یعنی نظام خداوندی۔ کے معنی ہیں خدا کو حاکم یا حَکم (ہر معاملہ میں فیصلہ دینے والا) تسلیم کرنا۔ ان الحکم الا للہ۔ حکم صرف خدا کا واجب الاطاعت ہے۔۔۔ امر الا تعبدوا الا ایاہ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت (اطاعت) اختیار نہ کرو۔

(٦) خدا کو حاکم یا حَکم تسلیم کرنے کا عملی طریق اس کی کتاب کو حَکم تسلیم کرنا ہے۔ (رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے قرآن کریم میں اعلان کرایا گیا کہ) اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (6:115) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حَکم تسلیم کروں' درآں حالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو تمام معاملات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔۔۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کو حَکم ماننے سے خدا کو حَکم مانا جاتا ہے۔

(۷) یہی کتاب کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔ جو کتاب خداوندی کو حَکم تسلیم نہیں کرتا' تو ایسے ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۸) خود رسول اللہ کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48)۔

اے رسول! تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔

(۹) یہی دین اللہ ہے (3:82)۔اسی کا نام الاسلام ہے۔یعنی کتاب اللہ کو حکم تسلیم کرنا۔ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ (3:85)۔جو شخص اس کے سوا کوئی اور دین (نظام) اختیار کرے گا' تو بارگاہ خداوندی میں اسے شرف قبولیت حاصل نہیں ہوگا۔وہ مردود قرار پائے گا۔

واضح رہے کہ چونکہ خدا نے اسلام کو دین اللہ کہا ہے اس لئے اس کا ترجمہ دین خداوندی ہی کرنا چاہیئے خدا کے رسول' دین اللہ کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔خود کوئی دین وضع نہیں کرتے تھے۔اس لئے اسلام کو دین مصطفیٰؐ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔اسے دین اللہ ہی کہنا چاہیئے۔

(۱۰) سوال پیدا ہوگا کہ اس کی پہچان کیا ہوگی کہ ہم میں دین اللہ (یا نظام خداوندی) قائم ہے یا نہیں؟ اس کی اولین پہچان یہ ہے کہ جس قوم میں دین اللہ قائم ہو اس میں مذہبی فرقے نہیں رہ سکتے۔ جہاں مذہبی فرقے ہوں گے نہ وہاں دین اللہ (نظام خداوندی) ہوگا اور نہ ہی ان کے ساتھ رسولؐ اللہ کا کوئی تعلق۔اس باب میں خدا کا ارشاد نہایت واضح ہے کہ:۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ (6:159)۔

جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ جائیں۔

اے رسول! تیرا ان لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رہے گا۔

جو لوگ فرقوں پر قائم رہتے ہوئے ''نظام مصطفیٰؐ'' کے مدعی ہیں' انہیں اس ارشادِ خداوندی پر غور کرنا چاہیئے۔ جب (فرمانِ خداوندی کی رو سے) مصطفیٰؐ کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا' تو انہیں ''نظام مصطفیٰؐ'' کے دعوے دار ہونے کا حق کس طرح پہنچ سکتا ہے؟

ملک میں جو لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' ہماری ان سے گذارش ہے کہ وہ ان ارشاداتِ خداوندی پر غور کریں اور سوچیں کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں کا یہ دعویٰ کہ وہ ''نظام مصطفیٰؐ'' (یا اسلامی نظام) قائم کریں گے' کس طرح حق پر مبنی ہوسکتا ہے؟

(ماہنامہ طلوع اسلام' ستمبر 1977ء)

☆......☆......☆

اسلام اور علمائے کرام

کسی قوم کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی کوئی اور بھی ہوسکتی ہے کہ وہ مسلمان کہلائے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ وہ صبح سے شام تک سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں بار اسلام کا لفظ دہرائے لیکن یہ متعین نہ کر سکے کہ اسلام کیا ہے؟ کسی غیر قوم کے کانوں تک یہ بات پہنچایئے تو وہ اسے باور ہی نہ کرے اور اگر اسے واقعات کی شہادت سے باور کرایا جائے تو اس کے بعد وہ جو کچھ ہمارے متعلق کہے گا' ناگفتہ بہتر۔۔1953ء کے ہنگاموں کے بعد' کمیٹی نے (ملک کے عوام سے نہیں) حضرات علمائے کرام سے کہا کہ یہ بتایئے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں' تو بہت سوں نے اس سوال کا جواب ہی نہ دیا' اور جنہوں نے جواب دیا' ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہ ملا۔ اب سولہ سال کے بعد' ملک میں یہ سوال عام ہو رہا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اس سوال کی ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے کہ اس بات کا فیصلہ کیا جانا مطلوب ہے کہ فلاں شخص کا فلاں نظریہ' عقیدہ' یا عمل' اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اس سوال کے جواب میں جو بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں ان سے پھر 1953ء میں علمائے کرام کے جوابات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس باب میں مثالیں تو اتنی پیش کی جاسکتی ہیں کہ آپ کو ان کے پڑھنے کے لئے وقت ہی نہ ملے لیکن ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے' یہاں دو چار پر اکتفا کریں گے۔ انہی دو چار دانوں سے آپ دیگ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اگست 1969ء کے ماہ نامہ میثاق (لاہور) میں' ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لٹ' کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''مجوزہ تعلیمی پالیسی''۔ یہ درحقیقت تبصرہ ہے حکومت کی طرف سے حال ہی میں شائع کردہ تعلیمی پالیسی پر۔ اس سلسلہ میں وہ' ملک و ملت کے لئے اسلام کی بنیادی حیثیت واہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اب تک اسلام کو پاکستانی ریاست کے تمام اعمال وافعال' بالخصوص تعلیم کی روح

بنانے کے راستہ میں جن فرضی رکاوٹوں کا ذکر کیا جا تا رہا ہے' ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اسلام کیا ہے۔ اب تک اسلام کی وضاحت کوئی نہیں کر سکا۔ آخر ہم کس اسلام کو جامۂ عمل پہنائیں اور دوسری یہ کہ اسلام میں کئی فرقے ہیں۔ اگر اسلام یہاں لایا گیا تو وہ کس فرقے کا اسلام ہوگا۔

اعتراضات آپ نے دیکھ لئے۔ اب پہلے' ان پر تنقید ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

یہ دونوں اعتراضات قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ یہ یا تو ان لوگوں کے توہمات ہیں جو اسلام سے ناواقف ہیں اور جن کی تربیت ایسے بے دین' بے علم اور دہریت پسند ماحول میں ہوئی ہے کہ ان کو موقعہ ہی نہیں مل سکا کہ وہ اسلام کو جان سکیں یا سمجھ سکیں یا یہ ان لوگوں کے بہانے ہیں جو اپنی سفلی اور حیوانی خواہشات میں اس قدر غرق ہیں کہ اسلام کے مرد آزما اور مرد آفریں اخلاقی ضابطے کو اپنے آپ پر عائد نہیں کر سکتے اور اسلام کی آمد کے خیال سے کانپ جاتے ہیں یا یہ ان لوگوں کی چالیں ہیں جو دوسرے ازموں کے پراپیگنڈہ کا شکار ہو چکے ہیں اور دل ہی دل میں ان کے فروغ کے متمنی ہیں اور یا پھر یہ ان مغربی دانش وروں کا گمراہ کن پراپیگنڈہ ہے جو ڈرتے ہیں کہ اگر اسلام ایک سیاسی' علمی اور اخلاقی قوت کی حیثیت سے پھر دنیا میں ابھر آیا تو ان کی بے خدا تہذیب ان کے سامنے مٹ کر رہے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ صاف اور واضح دین ہے کہ اس کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں کوئی دیانت دار اور واقف حال انسان کسی شک یا الجھن میں نہیں رہ سکتا اور اسلام میں کوئی ایسے فرقے موجود نہیں جو اسلام کی ضروری اور بنیادی باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ (صفحہ 3)

کتنی بڑی نوید جاں فزا ہے یہ نشید دلنواز کہ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کا ایک ایسا مفہوم پا لیا ہے جس میں کسی کو کوئی شک یا الجھن نہیں ہو سکتی' اور جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ یقیناً آپ یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہوں گے کہ اسلام کا وہ مفہوم کیا ہے۔ ہم آپ کو

زیادہ دیر تک زحمت کشِ انتظار نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ مفہوم ملاحظہ فرمالیجئے۔ ارشاد ہے۔

ان دنوں بعض لوگ اسلامی اصولوں کے نفاذ کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول' خدا کی محبت اور عبادت ہے یعنی یہ کہ انسان خدا سے محبت کرے۔ خدا کی ستائش کرے اور اپنے تمام اعمال وافعال کو خدا کی محبت کے تابع بنائے۔ کلمہ توحید اسی اصول کا بیان ہے۔ یہ اصول' اسلام کی ابتدا اور انتہا ہے۔ اس کے بغیر اسلام کی کوئی ہلکی سی ابتداء بھی ممکن نہیں اسلام کے اور تمام اصول اسی اصول سے نکلے ہیں اور اسی پر مبنی ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا اسلام کے بنیادی اصول کیا ہیں اس کے بعد' اس امر کا فیصلہ کرنے میں کسی کو کوئی دقت پیش آسکتی ہے کہ فلاں شخص کا فلاں نظریہ' عقیدہ یا عمل' اسلام کے خلاف ہے یا نہیں؟

اب رہا اس اصول کا متفق علیہ ہونا۔ سو میثاق کی زیر نظر اشاعت کے ساتھ ہی' مجلّہ ایشیاء کا 7 اگست کا شمارہ سامنے آیا ہے۔ اس میں ایک صاحب نے مودودی صاحب سے کہا۔

انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے ہرگز خوف پر مبنی نہیں ہوسکتا...... یہ نظریہ ایک پاکستانی مفکر کا ہے۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

یہ نظریہ قرآن وحدیث دونوں سے ٹکراتا ہے۔ قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ خدا سے ڈرو بھی اور اس سے محبت بھی کرو۔ ڈر' خوف' طمع اور محبت یہ سب انسان کے فطری جذبات ہیں اور عملی زندگی میں انسان ہر وقت ان کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو راہ راست پر رکھنے کے لئے ان فطری جذبات کا مرجع اپنی ذات کو قرار دیا ہے تا کہ انسان کے ان جذبات میں اعتدال وتوازن قائم رہے اور یہی جذبات اس کے لئے نیکی وبھلائی کے فروغ کا ذریعہ ثابت ہوں۔ مثلاً یہ فرمایا گیا ہے کہ اپنے رب سے ڈرو جو شخص اپنے رب سے ڈرے گا' وہ ساری دنیا کا خوف اپنے دل سے نکال دے گا اور دنیا کی

کوئی طاقت بھی اسے حق پرستی سے باز نہ رکھ سکے گی۔ اس کے برعکس، اگر وہ بندوں سے ڈرے گا تو ان کے ڈر سے بہت سے بھلائی کے کاموں کو بھی چھوڑ بیٹھے گا۔ اسی طرح فرمایا کہ طمع اپنے خدا سے ہونا چاہئے۔ یعنی دنیا میں کسی اور سے لالچ نہ رکھو۔ لالچ تمہیں صرف اپنے خدا سے رکھنی چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص خدا سے لالچ رکھے گا وہ کبھی برے کاموں میں اپنی جان اور مال نہیں کھپا سکتا۔ نیک کاموں میں ہی انہیں صرف کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کا جذبہ بھی انسان کو راہ راست سے بھٹکنے نہیں دیتا جو مفکر صاحب یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے رشتہ ہرگز خوف پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ وہ بے سوچے سمجھے ایک بات کہتے ہیں۔

یعنی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے نزدیک، اسلام کا بنیادی اصول، خدا سے محبت اور صرف محبت ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نظریہ قرآن اور حدیث دونوں سے ٹکراتا ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول، خدا سے خوف اور محبت، دونوں ہیں۔

اب یہ بات، ڈاکٹر صاحب موصوف اور مودودی صاحب کے طے کرنے کی ہے کہ ان میں سے کس کا نظریہ، اسلام کے مطابق ہے اور کسی کا اس کے خلاف۔

☆......☆......☆

اس کے بعد ہمارے سامنے، جماعت اسلامی کے نظریات کا ترجمان، ماہ نامہ چراغ راہ (کراچی) کا اگست کا شمارہ آتا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنے متعلق کہہ رکھا ہے کہ وہ نہ قدامت پسند طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں نہ جدت پسند سے۔ وہ ''بیچ کی راس'' کے آدمی ہیں۔ اس بنا پر، جماعت اسلامی کے نقبا کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ وہ قدامت پرست طبقہ میں بھی کیڑے ڈالتے رہتے ہیں اور جدت پسندوں میں بھی، تاکہ اس سے بیچ کی راس کے آدمی کی اہمیت نمایاں ہو جائے مذکورہ بالا ماہ نامہ چراغِ راہ کے افتتاحیہ میں بھی یہی موقف اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے قدامت پرستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

کیا ایسے لوگ ہمارے معاشرہ کا کوئی موثر طبقہ ہیں اور کیا وہ عوام کے اندر

اتنے اثر ورسوخ کے مالک ہیں کہ لوگوں کو اسلام کو حقیقی معنوں میں اختیار
کرنے سے روک سکیں؟ کیا لوگ ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔

اس طبقہ کے اسلام' اوران کی حیثیت کو یوں ختم کرنے کے بعد' چراغ راہ جدت پسند طبقہ پر برسا ہے' اوراسے اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے کر لکھتا ہے۔

اس کشمکش کا صرف ایک ہی حل ہے' اور وہ یہ کہ مغرب زدہ طبقہ اپنی روش پر نظر ثانی کرے اورامت کی مجموعی رائے کے مقابلے میں اپنی قلیل اقلیت کی رائے پر اصرار نہ کرے اور حقیقی اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی روش ترک کر دے وہ اس حقیت کو تسلیم کرکے کہ یہ امت اگر دینی و دنیاوی ترقی سے بہرہ یاب ہوسکتی ہے تو حقیقی اور بے آمیز اسلام کے سائے تلے ہی ہوسکتی ہے۔ اس کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش' اس کے ساتھ ایک بدخواہی ہے۔ امت مسلمہ ہر اس شخص کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرنے پر تیار ہے جو اس کے معاشرے کے بگاڑ کو دور کرکے اسے دین کی حقیقی شاہراہ پر چلا دے۔ وہ ان ہی لوگوں کی راہنمائی دل سے تسلیم کرسکتی ہے جن کے کے بارے میں اسے یہ اعتماد ہو کہ وہ دین کے معاملے میں مخلص ہیں اوران کا کوئی قدم خدااور رسولؐ کی منشاء کے خلاف نہ اٹھے گا۔

یعنی ان کے نزدیک' ''حقیقی اور بے آمیز اسلام'' امت کی مجموعی رائے کا نام ہے۔ یہ وہی امت ہے جسے مودودی صاحب ''چڑیا گھر کے جانور'' قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان میں سے (999) فی ہزار' اسلام کی الف۔ ب تک سے نا آشنا ہیں اور ان کی مجموعی رائے کے مطابق جو حکومت قائم ہوگی۔ وہ ''مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی''۔

لیکن چراغ راہ کے مقالہ کی رو سے' ان کی ''مجموعی رائے'' بھی اسلام میں سند کا درجہ نہیں رکھے گی' اس لئے کہ یہ خود دوسروں کی راہنمائی کے محتاج ہوں گے۔ لہٰذا' سند وحجت ان لوگوں کا اسلام ہوگا' جن کی راہنمائی یہ لوگ دل سے تسلیم کریں گے اور یہ' دل سے راہنمائی انہی کی تسلیم کریں گے۔

جن کے بارے میں انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ دین کے معاملہ میں مخلص ہیں

اوران کا کوئی قدم خدااوررسولؐ کی منشاء کے خلاف نہ اٹھے گا۔

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگ' جماعت اسلامی کے''صالحین'' کے سوااور کوئی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا' ان حضرات کے نزدیک' اسلام نام ہوا جماعت اسلامی کے اتباع کا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام کی صحیح تعبیر علمائے کرام کے ہاں سے مل سکتی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کا علماء کے بارے میں بھی عجیب مسلک ہے۔ جب علماء حضرات ان کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ انہیں من حیث الجماعت مردود قرار دیتے ہیں۔ 45-1944ء کی بات ہے۔ علامہ موسیٰ جاراللہ مرحوم نے' مودودی صاحب کے نام ایک خط میں ہندوستان کے علماء کی حالت کے خلاف شکایت کی۔ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ۔

اس کا حرف حرف صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ تحقیر کے وہ سزاوار ہیں لیکن نہایت ادب کے ساتھ ہم اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علماء نہیں ہیں بلکہ اس باب میں تمام عالمِ اسلام کے علماء کا حال یکساں ہے...... ہر جگہ کے علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے (ہیں) اور قدرت کی طرف سے ان جرائم کی جو سزا مقرر تھی وہ ان کو مل چکی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری۔ فروری 1945ء)

لیکن' جب یہی علماء کسی بات میں ان کے ہم نوا ہوتے ہیں' تو ان کا قول' اسلام میں سند قرار پا جاتا ہے (مثلاً) پاکستان ٹائمز کی اشاعت بابت 14 اگست 1969ء (یوم آزادی نمبر) میں' مودودی صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کے عنوان کا ترجمہ ہے''ایک پاکستانی کے نزدیک آزادی کا مفہوم کیا ہے۔'' اس میں وہ ان قوانین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کی مخالفت مودودی صاحب نے کی تھی' لکھتے ہیں۔

پاکستان کے مسلمان حکمرانوں نے علماء کے متفقہ فتویٰ کے علی الرغم اسلامی قوانین میں ترمیم وتنسیخ اور تغیر وتبدل کر دیا۔

☆......☆......☆

میثاق اورالمنبر (لائل پور)' دونوں' کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو 1985ء میں''اٹھارہ برس

کے بعد' جماعت اسلامی کے راہ گم کردہ قافلے'' سے الگ ہوئے تھے۔ میثاق کا نظریہ اسلام ہم دیکھ چکے ہیں۔ اب المنبر کی تشریحات ملاحظہ فرمائیے۔ اس نے اپنی اشاعت' بابت 25 جولائی لغایت یکم اگست کے صفحہ اول پر' صدر مملکت کے اس اعلان پر ہدیہ تبریک پیش کیا ہے کہ ''اگر کوئی گروہ یا جماعت' اسلام کے بنیادی اصولوں اور پاکستان کی سالمیت کے منافی کوئی بات پھیلائے گی' یا ہمارے عوام کے اتحاد و استحکام میں رخنے ڈالنے کی کوشش کرے گی تو وہ عوام اور ان کی مسلح افواج کے غیظ و غضب کو دعوت دے گی'' اس کے بعد' اس نے لکھا ہے کہ ''اتنے عظیم کارنامے کو انجام دینا اگرچہ صدر مملکت کی ذمہ داری ہے' تاہم ہر پاکستانی مسلمان پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس اہم کام میں صدر مملکت کا ہاتھ بٹائے۔ اس کے بعد' اس نے لکھا ہے۔

> ''اس سلسلے میں سب سے پہلا تعاون یہ ہے کہ ان کوششوں کی نشاندہی کی جائے جو پاکستان میں اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی مسلسل جاری ہیں اور جن سے ایک طرف مملکت عزیز کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہے اور دوسری جانب پاکستانی عوام کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا ہے' اور وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو رہے ہیں...... اس تعاون ہی کے جذبے سے ہم عرض کریں گے کہ سب سے زیادہ شر انگیز حرکتیں جو پچھلے بائیس برس سے خلاف اسلام و پاکستان ہو رہی ہیں' ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

اور وہ شر انگیز حرکتیں' المنبر کے الفاظ میں یہ ہیں۔

1- اب تک اسلام کا شور مچایا گیا' اور متعدد ادارے' بھی اس مقصد کے لئے قائم کئے گئے کہ یہاں اسلام کو فروغ حاصل ہو' مگر عملاً ہوا یہ کہ ''اسلام'' ہی کو اپنی غلط زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی اور اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کرنے کی کوشش کی گئی جو مغربی زندگی کی قائم ملعون عادتوں کو سند جواز مہیا کرے' بالفاظ واضح' اسلام میں تحریف و ترمیم کے دروازے کھولے گئے اور اسلام کے ''مغربی ایڈیشن'' کی تیاری کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گئے۔

2- ثقافت کے نام پر اسلامی قدروں کو ملیامیٹ کرنے کی پوری پوری کوشش ہوئی اور جن امور کو اسلام نے غیر مبہم انداز میں خدا کے غضب کو بھڑکانے کا باعث بتایا تھا' ثقافت کے نام پر ان سب کو عام کیا گیا۔ عریانی' بے حجابی' رقص' سرود' مردوزن کا اختلاط اور پھر ان محفلوں میں شراب نوشی اور دوسرے محرکات کا ارتکاب عام ہوا۔

3- اسلام کے ساتھ بعض دوسرے ازموں کو گڈمڈ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور بات ''اسلامی سوشلزم'' خالص سوشلزم اور پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کی مساعی تک پہنچی۔

4- اس مقصد کے حصول کے لئے صوبائی عصبیتوں کو ابھارا گیا۔ طبقاتی نزاع کو ہوا دے کر باہمی تصادم کی تحریکات چلائی گئیں اور اسلامی مشاہیر کے بالمقابل غیر مسلم مشاہیر ملحدانہ تحریکات ونظریات کے علمبرداراور غیر ملکی راہنماؤں کی تصاویر کو پوجا جانے لگا اور فخر ومباہات سے ان کی تصویروں کے بیج سینوں پر آراستہ کئے گئے۔

5- حضور خاتم النبین علیہ التحیۃ والتسلیم کی ذات اقدس جو اس امت کے لئے واحد مرکزی حیثیت اور نکتہ اتحاد ہے' آپؐ سے رشتہ اخلاص کمزور کرنے کے لئے بعض اشخاص کو بحیثیت ورسول کے پیش کیا گیا اور ببانگ دہل کہا گیا کہ اگر ان پر ایمان نہ لایا گیا تو حضورؐ پر ایمان سے نجات حاصل نہ ہو سکے گی۔

ان تفصیلات کو بیان کرنے کے بعد'المنبر نے کہا ہے۔

یہ اور اس قسم کی تخریبی مساعی ہیں جو اسلام اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف مسلسل جاری' ہیں اور جن کی وجہ سے ملت اسلامیہ پاکستان انتشار اور باہمی تصادم میں مبتلا ہے۔ اگر صدر مملکت' اپنے عظیم اور دوٹوک اعلان کے مطابق ان سرگرمیوں کا سد باب کرسکیں تو اسلام کی اس عظمت کو بحال کرنے کے راستے کھل جائیں گے جن کی بحالی کو آپ نے 25 مارچ کے انقلاب کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا......اللہ تعالیٰ صدر مملکت کو اس عظیم کارنامہ کے انجام دینے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین! یارب العالمین!!

☆......☆......☆

یہ رہا مذہب پرست طبقہ‘ جہاں تک ’’مسٹروں‘‘ کا تعلق ہے‘ ان کی کیفیت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ پاکستان ٹائمز کی 14 اگست 1969ء کی اشاعت میں‘ ڈاکٹر جاوید اقبال (خلف الرشید علامہ اقبالؒ) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ’’آئیڈیالوجی آف پاکستان ۔‘‘ اس میں وہ رقمطراز ہیں:۔

پاکستان کی اسلامی مملکت‘ ایک مثالی سیکولر مملکت کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے‘ ان معنوں میں کہ پاکستان میں ’’شخصی معاملہ (Personal Affair) ہے‘ اور مملکت اپنے تمام شہریوں ۔۔۔ سنی‘ شیعہ‘ وہابی اور اسلام کے دیگر فرقوں ۔۔ کی مادی ترقی اور فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہے۔

اس کے برعکس‘ مودودی صاحب‘ ایک ایسی مملکت کو جس میں مذہب‘ افراد کا شخصی معاملہ قرار پائے‘ ’’مسلمانوں کی کافرانہ حکومت‘‘ قرار دیتے ہیں۔

☆......☆......☆

یہ ہیں اسلام کے وہ چند بنیادی اصول و مفاہیم جو پچھلے چند دنوں میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آپ ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا اس سے اسلام کا کوئی متفق علیہ مفہوم سامنے آتا ہے؟ اور ابھی ہم نے اس اسلام کا ذکر ہی نہیں کیا جو مختلف فرقوں کے نزدیک ’’حقیقی اسلام‘‘ ہے۔ ان حالات میں یہی کہا جائے گا کہ خیریت اسی میں ہے کہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اسے خاموشی سے مسلمان تصور کر لیا جائے۔ لیکن یہ ’’خیریت‘‘ تو اسی وقت تک ہے جب تک ہمارے ہاں کے اسلام کے اجارہ دار حضرات کے ہاتھ میں اقتدار نہیں آتا۔ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو پھر یہ خیریت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک‘ نہ کوئی پیدائشی مسلمان‘ مسلمان قرار پا سکتا ہے اور نہ ہی کسی شخص کو محض اس بنا پر مسلمان تصور کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ مودودی صاحب نے واضح الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ

جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو وہ ضرور

مسلمان ہوگا۔ (ترجمان القرآن۔بابت محرم 1360ھ)

چنانچہ جب انہوں نے پہلے پہل اس جماعت کی تشکیل کی ہے تو انہوں نے اس میں شامل ہونے والوں کی، اپنے ہاتھ میں تجدید ایمان کی تھی۔لہٰذا، ان کے نزدیک نہ کسی کا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونا اسے مسلمان تصور کرا سکے گا اور نہ ہی اس کا یہ کہنا کہ وہ مسلمان ہے۔انہیں ان جیسا اسلام لا کر مسلمان ہونا پڑے گا، ورنہ ایک سال کے نوٹس کے بعد انہیں قتل کر دیا جائے گا۔(تفصیل کے لئے دیکھئے۔طلوع اسلام۔بابت جولائی 1969ء کے لمعات) مودودی صاحب غالباً ابھی سے ان لوگوں کی فہرستیں مرتب فرما رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقالہ، (مطبوعہ پاکستان ٹائمز۔14 اگست) کے آخری پیرا میں لکھتے ہیں۔

یہ چیز ہمارے چہروں پر جلی حروف میں لکھی ملتی ہے کہ یہاں ایک ایسی قوم ہے جو انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کے بعد، اور بھی زیادہ انگریز بننے کے لئے شائق ہے۔اگر (ان میں سے) کوئی انگریز نہیں بن سکا تو وہ امریکن یا روسی یا چینی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ مسلمان رہنے یا بننے کا وہ قطعاً خواہشمند نہیں۔اتنا ہی نہیں۔ہماری پیشانیوں پر یہ بھی لکھا ملتا ہے کہ یہاں ایک ایسی قوم بھی ہے جو اپنے انگریز آقاؤں کے چلے جانے سے خوش نہیں۔ یہ کچھ مبالغہ آمیز سی بات نظر آئے گی لیکن ہے یہ حقیقت۔اس لئے کہ ہم انگریزی بولنا، انگریزوں کی طرح رہنا سہنا، انگریزوں کے مسلط کردہ نظام تعلیم کو باقی رکھنا اور اپنے معاملات کو انگریزوں کے انداز کے مطابق طے کرنا پسند کرتے ہیں۔مختصراً ہم اس بات کے لئے قطعاً تیار نہیں کہ جو چیز انگریزوں سے متعلق ہے اسے خیر باد کہہ کر اپنے اس انداز زیست اور کلچر کا احیاء کریں جس کا تصور اسلام نے دیا ہے۔

اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، پاکستان میں اسلام، کوئی نجی عقیدہ، یا شخصی معاملہ نہیں رہا کہ اس کا جو تصور کسی کو پسند آئے وہ اسے اختیار کر لے۔اس نے یہاں مملکت کے بنیادی نظریہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔کم از کم ہم سب کا دعویٰ یہی ہے اور بعض معاملات میں اس کی یہ حیثیت

عملی طور پر بھی سامنے آتی ہے۔ مثلاً پاکستان کے آئین کی رو سے (خواہ وہ 1956 کا تھا 1962ء کا) صدر مملکت کا ''مسلمان'' ہونا لازمی تھا اور ممکت کے قوانین کا اسلام کے مطابق ہونا بھی بنیادی تقاضا۔ اب محترم صدر مملکت نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی کسی بات کا پھیلانا' مسلح افواج کے غیظ وغضب کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ آپ سوچئے کہ اسلام کی ہمارے ہاں پوزیشن تو یہ ہے کہ (اور اس کی ایسی پوزیشن ہونی ہی چاہئے) لیکن اس کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہمارے ہاں متعین نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہم بائیس برس سے پریشانیٔ فکر ونظر کی وادیوں میں بدحواس پھر رہے ہیں اور ہمارا کوئی قدم منزل کی طرف نہیں اٹھتا۔ اس لئے کہ جب منزل ہی متعین نہ ہو تو اس کی طرف قدم کیسے اٹھے؟ جو قوم بھی اپنے نظریات حیات کا مفہوم متعین نہیں کرتی' اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یاد رکھئے۔ جب تک اسلام کا مفہوم متعین نہیں کیا جاتا' نہ ہمارے آئین وقوانین اسلام کے مطابق مرتب ہو سکتے ہیں' نہ ہم اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا کون سا نظریہ اور عقیدہ اسلام کے خلاف ہے اور نہ ہی ہم میں ملی وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ رکھنا چاہئے کہ تعین منزل کا نام ایمان ہے اور اس کی طرف عملاً قدم اٹھانے کا نام اسلام اور یہی نظریہ پاکستان ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہمارا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم متعین کرتے۔ ہم نے آج تک یہ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام اور نظریہ پاکستان کے الفاظ' دن رات دہرائے جاتے ہیں لیکن ہماری عملی زندگی میں ان کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہی بائیس برس پہلے کرنے کا کام تھا' اور یہ آج کرنے کا کام ہے۔ لیکن

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر!

☆......☆......☆

اسلام کیا ہے؟

اسلام نام ہے قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا۔ ان کی اطاعت کرنے کا۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس‘ ان قوانین سے انکار‘ انحراف اور سرکشی کا نام کفر ہے۔

کائنات کی سجدہ ریزی

آپ اس عظیم القدر اور محیر العقول کارگہِ کائنات پر نگاہ ڈالئے‘ اس میں ہر شے لگے بندھے قانون کے مطابق مصروف عمل ہے۔ کسی کو ان قوانین سے یارائے انحراف نہیں۔ مجالِ سرکشی نہیں‘ کوئی اس راستے سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتا جو اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ (22:18)

کیا تو نے اس پر غور کیا کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار......سب قوانینِ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

یہ سب اس کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہیں اور ان میں سے کسی کو ان سے مجالِ سرکشی نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (16:49)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے‘ خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں سب قوانین خداوندی کے سامنے سربسجود ہیں اور اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

ان کا منصبِ زندگی اور نہجِ حیات یہ ہے کہ **يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ** (16:50) جو حکم انہیں دیا جاتا ہے‘ اس کے مطابق کام کئے چلے جاتے ہیں۔

سمٰوٰت کی تحیر انگیزی

قرآن کریم نے اوپر کہا ہے کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ

ہے‘ سب قوانین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے؟ اس حقیت پر غور کرنا تو بہت بڑی بات ہے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے مطابق کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے سرگرم عمل ہے اور وہ چیزیں ان قوانین کی اطاعت کس طرح کرتی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جنہیں قرآن کریم ’’سمٰوٰت‘‘ (بلندیاں) کہہ کر پکارتا ہے‘ وہ کس قدر تحیر انگیز مظاہرِ فطرت کا گہوارہ ہیں۔ اس زمانہ میں‘ وسائلِ رسل ورسائل کی کثرت اور ذرائع آمدورفت کی فراوانی سے‘ اس حقیقت کو تو ہم سمجھ گئے ہیں کہ ہماری زمین ایک عظیم الجثہ کُرّہ ہے جو ہر وقت گردش میں مصروف ہے لیکن ہم میں سے بہت کم ہوں گے جنہیں اس کا علم ہوگا کہ کائنات کی ان حدود فراموش بلندیوں میں جس قدر اجرام فلکی تیر رہے ہیں‘ ان میں ہماری زمین کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرے کی۔ یہ مثال شاعری نہیں‘ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ سورج۔۔۔ جو ہمیں ایک طشت سے زیادہ بڑا نظر نہیں آتا اور جو ہم سے زیادہ دور بھی نہیں صرف نو کروڑ انتیس لاکھ (9,29,00,000) میل دور ہے۔ اس کا قطر ہماری زمین سے 109 گنا‘ بڑا ہے۔ یعنی آٹھ لاکھ۔ چونسٹھ ہزار (8,64,000) میل۔ اس کی جسامت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس میں ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم کرہ بایں ہمہ ضخامت وجسامت‘ دیگر اجرامِ سماوی کے مقابلہ میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے جتنی سمندر میں ایک قطرہ۔

یہ ستارے‘ جو شب کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے چراغ دکھائی دیتے ہیں‘ ان میں سے جو ستارہ ہم سے قریب ترین ہے‘ وہ ہم سے کتنی دور ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جتنی دور ہم سے سورج ہے‘ اسے دو لاکھ ستر ہزار سے ضرب دیجئے تو اس کا ہم سے اتنے میلوں کا فصلہ ہے۔ ہمارا قریب ترین ستارہ ہم سے اتنی دور ہے۔

اجرام فلکی کے فاصلے‘ ہماری سڑکوں کے میلوں سے نہیں ماپے جاتے۔ انہیں ’’روشنی کے سالوں‘‘ سے ماپتے ہیں۔ روشنی‘ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک سال میں کس قدر مسافت طے کرتی ہوگی۔ ایسے ستارے بھی ہیں جن

کی روشنی ہم تک (1,85,000) سال میں پہنچتی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ روشنی' ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے اس ستارے سے ہم تک ایک لاکھ' پچاسی ہزار سال کے عرصہ میں پہنچتی ہے یہ تو خیر دور کے ستاروں کی بات ہے یہ کہکشاں' جسے ہمارے شاعر گردِ مرمریں کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں' لاتعداد ''ستاروں کی دنیا'' کا مجموعہ ہے ان میں سے قریب ترین ستارے کی روشنی ہم تک اٹھارہ ہزار چار سو روشنی کے سال میں پہنچتی ہے۔ آسمانوں میں ستارے کتنے ہیں' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اگر ہم ڈیڑھ ہزار ستارہ فی منٹ کے حوالے سے گننے لگیں تو سات سو سال میں ان کی گنتی پوری ہو۔

اور ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔'' اس دنیا کو ہیولیٰ کائنات (Nebula) کہا جاتا ہے۔ ہماری دوربین' جس بعید تریں ہیولیٰ کو اس وقت تک پا سکتی ہے وہ ہم سے پچیس کروڑ روشنی کے سال (Light Years) کے فاصلے پر ہے۔ یعنی وہاں سے روشنی' ایک سیکنڈ میں' ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے' ہم تک پچیس کروڑ سال میں پہنچ سکتی ہے۔

آپ نے سمٰوٰت کی وسعتوں اور بلندیوں کا اندازہ فرمایا؟ یہ ہیں وہ سمٰوٰت جن میں ہر شئے' قوانین خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہے اور کسی کو اس کی مجال نہیں کہ اپنے مقررہ راستے سے انچ کا ہزارواں حصہ بھی ادھر ادھر ہو جائے یا اس کی رفتار میں سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا بھی فرق پڑ جائے۔

کشش ثقل

یہ تمام اجرام فلکی' کائنات کی فضا میں معلق ہیں۔ یعنی ایسے ستونوں سے جکڑے ہوئے جنہیں قرآن کریم' ''غیر مرئی'' کہہ کر سمجھاتا ہے جہاں کہتا ہے کہ **اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا** (13:2) اللہ وہ ہے جس نے ان تمام عظیم القدر اجرام سماوی کو بلندیوں میں تھام رکھا ہے' بغیر ایسے ستونوں سے جنہیں تم دیکھ سکو۔ یہ غیر مرئی ستون' وہ کششِ ثقل (Gravitational Pull) ہے جو ایک دوسرے کرے کو تھامے ہوئے ہے۔

آپ نے فضائے آسمانی کی وسعتوں اور اجرام سماوی کی تعداد کے متعلق کچھ سن لیا ہے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان مختلف اجرام میں فاصلہ کس قدر ہے اور پھر یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ان تمام

اجرام فلکی کوایک دوسرے کی کشش تھامے ہوئے ہے اس کششِ ثقل سے متعلق قانون کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایئے کہ سرجیمس جینز کے الفاظ میں' اگر ہم اپنی ایک انگلی بھی ہلائیں تو اس کا اثر اجرام فلکی میں سے ہر ایک پر پڑتا ہے۔ اجرام فلکی کے وزن جسامت فاصلہ وغیرہ کے متعلق جس قدر معلومات حاصل کی جاتی ہیں' ان کی بیشتر بنیاد' کشش ثقل کا محیر العقول قانون ہے اور یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اگر کسی ستارے یا کرے کی کشش کے تناسب میں غیر محسوس سا فرق بھی آ جائے تو کائنات کا سارا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ تو اس بے پایاں فضا میں تیرنے والے عظیم الجثۃ اجرام فلکی کی محیر العقول عظمتوں اور وسعتوں کا ہلکا سا تصور ہے۔ دوسری طرف ذرات کی طرف آیئے تو ایک قطرہ پانی میں کروڑوں سالمات (Molecules) ہوتے ہیں اور ہر سالمہ میں ایک ایٹم آکسیجن کا اور دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا قطر' ایک سنٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ اس ذرہ ناچیز پر نگاہ رکھئے اور پھر اس کی اس عظمت پر کہ نظام شمسی کی طرح اس کا اپنا نظام ہے جس میں ایک مرکزی ہیولیٰ ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک برقیہ (Electron) گردش کرتا ہے۔ یہ برقیہ' سالمہ کے لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی رفتار کا اندازہ اس سے لگایئے کہ یہ اپنے محور کے گرد ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصہ میں' سات ارب دفعہ گردش کرتا ہے اور یہ گردش ایک غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یہ ہے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی نہایت خفیف سی جھلک۔

یہ کائناتی اسلام ہے

قرآن کریم نے اس تحیر انگیز نظام کائنات کو ایک لفظ میں بیان کر دیا ہے اور وہ لفظ ہے۔۔۔ اسلام۔۔۔ اور اسی کو اس نے دین اللہ کہا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (3:85)

کیا یہ لوگ دین اللہ۔ نظام خداوندی۔ کے خلاف کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ارض وسمٰوٰت میں جو کچھ ہے' سب طوعاً کرہاً اس نظام کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہے اور ہر ایک کی

گردش اسی محور کے گرد ہے۔

یعنی وہ نظام زندگی جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے' دین اللہ کہلاتا ہے اور کائنات کی ہر شے اسی دین کو اختیار کئے ہے اس نظام زندگی کو اختیار کرنے کا نام الاسلام ہے۔ یہی اندازِ زندگی صحیح منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ‌ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (3:84) جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور نظام زندگی چاہتا ہے' تو وہ نظام کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اور وہ آخرالامر نقصان اٹھائے گا۔

تسخیر کائنات

اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے کا دین (نظام زندگی) اسلام ہے۔ ہر شے قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے یہ اطاعت' ایک مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے۔ ہر شے کی تگ و تاز اور جد و جہد' خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ بَلۡ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ (2:116) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے تجویز فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروف عمل ہے اور ہر ایک نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لئے محفوظ اور وقف کر رکھا ہے۔ ''قٰنِتُوۡنَ'' کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ سقاء تنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہونے دے اور اسے برمحل صرف کرنے کے لئے روک رکر کھے۔ اشیائے کائنات میں لامحدود قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ ایک سورج کی توانائی ہی کو دیکھئے۔ وہ حرارت اور روشنی کا کیسا عظیم (Reservior) ہے لیکن کیا مجال جو اپنی توانائی کی ایک رمق بھی' اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد میں صرف کر جائے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اس کے ذمے ایک فریضہ عائد کر دیا گیا ہے اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں رات دن سرگرداں ہے۔ اسے عربی زبان میں ''تسبیح'' کہتے ہیں سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (57:1) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب نظام خداوندی کی تکمیل میں پوری شدت اور تیزی سے سرگرم عمل ہے۔ اس خدا کے نظام کی' تکمیل میں جو بڑی قوتوں اور عمدہ تدبیروں کا مالک ہے۔ نظام خداوندی

کا یہی وہ تاگہ ہے جس میں اس نے اشیائے کائنات کے ''تسبیح کے دانوں'' کو اس حسن وخوبی سے پرو رکھا ہے کہ کوئی ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتا۔ ان عظیم عناصر کو اس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے سکے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (45:13)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کے لئے قانون کی زنجیروں سے مسخر کر رکھا ہے۔ **اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ** اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے پھل پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے لئے سامان زیست ہیں **وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ** اس نے تمہارے لئے جہازوں کو قانون کی زنجیروں میں مسخر کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق تیرتے پھرتے ہیں **وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ** اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ **وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَيْنِ** کشتیاں سمندر اور نہریں ہی نہیں، اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند تک کو قانون کے حلقوں میں باندھ رکھا ہے اور وہ مسلسل ومتواتر چل رہے ہیں۔ **وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ** (14:32-33) اور اسی طرح اس نے دن اور رات کو تمہارے فائدے کے لئے ایک نظام کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کاراند
کہ تو نانے بکف آری و بغلفت نخوری

☆......☆......☆

کائنات کی طرف وحی

وہ قوانین جن کے مطابق اشیائے کائنات نے اپنے اپنے فرائض کو سرانجام دینا ہے، ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں، انہی کو قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وحی خداوندی ہے جو ان میں سے ہر ایک کی طرف براہ راست ہوتی ہے۔ **وَاَوْحٰى فِيْ**

كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (41:12) اور اس نے ہر سماء (بلندی) میں اس کے قانون کو وحی کر دیا اور اسی طرح ارض میں بھی بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (99:5) یہی وہ وحی ہے جس کی رو سے کائنات کی ہر شے' اپنی اپنی صلوۃ اور تسبیح سے واقف ہے کل قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (24:41) ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض زندگی کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کے لئے اس کے دوائر تگ وتاز کون سے ہیں۔ اس کو خدا نے اپنی طرف سے عطا کردہ ہدایت یا راہ نمائی سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (20:50) ہمارا نشوونما دینے والا وہ ہے جس نے ہر شے کو تخلیقی پیکر عطا کیا' اسے پیدا کیا۔ اور پھر اسے وہ راہنمائی عطا کر دی جس کے مطابق اس نے سفر زندگی طے کرنا ہے۔ اشیائے کائنات میں خدا کی یہ راہنمائی کس محیر العقول انداز سے کار فرما ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان چیزوں کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں۔ ان کے مشاہدات کے نتائج ایسے تحیر انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ (مثلاً) یورپ اور شمالی افریقہ کی جھیلوں اور ندیوں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے ایل (EEL) کہتے ہیں۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد یہ مچھلیاں اپنے اپنے مساکن سے باہر نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں دلدل اور گھاس میں سے گزرتی ہوئی ایک سے دوسری جھیل اور ندی میں پہنچتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے' بحر اطلانٹک میں' جزیرہ برموڈا کے قریب پہنچ جاتی ہیں جہاں سمندر بہت گہرا ہے۔ دوسری طرف' امریکہ کی ایل مچھلیاں بھی اسی طرح وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں' گہرے سمندر میں انڈے دے کر' مر جاتی ہیں۔ ان کے بچے' انڈوں سے نکلنے کے بعد' اپنے اپنے آبائی وطن کی طرف چل نکلتے ہیں اور انہی راستوں سے ہوتے' جن سے ان کے ماں باپ گزرے تھے' اپنی اپنی جھیلوں اور ندی نالوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی راستہ بھولتا ہے اور نہ ہی کسی غلط جگہ پہنچتا ہے۔ اس سفر میں انہیں تین سال تک کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ مشاہدہ کرنے والے ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن یہ راز

کسی پر نہیں کھلتا کہ وہ کون سی قوت ہے جو ان انڈوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو' جن کے ماں باپ ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے' ان کے آبائی وطن کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور وہ ہزاروں میل کی مسافت میں کہیں راستہ نہیں بھولتے۔

یہی کیفیت سامن مچھلی کی ہے۔ ہر نوزائیدہ سامن' کچھ وقت کے لئے سمندر میں جا رہتی ہے۔ پھر واپسی پر سمندر سے اس دریا میں پہنچتی ہے جس سے وہ سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دریا سے' اس معاون ندی کا رخ کر لیتی ہے جو اسے اس دریا میں لائی تھی اور اس ندی سے پھر اپنی مرز بوم تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر آپ اسے راستے میں پکڑ کر کسی غلط ندی میں چھوڑ دیں' تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے فوراً پیچھے کی طرف لوٹ کر۔ بڑے دریا میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے اپنی صحیح ندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

یہی کیفیت مہاجر پرندوں (Migratory Birds) کی ہے۔ بحرالکاہل میں بہت سے جزیرے ہیں جہاں خاص قسم کے پرندوں کے سوا کوئی جاندار نہیں ملتا۔ یہ پرندے' سردی کے موسم میں جزائر ہوائی (Hawaii) میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دو ہزار تین سو میل کا سفر' سمندر کے اوپر' ایک ہی اڑان میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ وہاں انڈے دے کر واپس آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کے بچے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں' تو وہ اپنے ماں باپ کے ''نقشِ قدم'' پر (جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا اور جنہیں انہوں نے دیکھا تک نہ تھا) سیدھے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں' سمندر کے اوپر' وہ کون سے نشاناتِ راہ ہیں جو ان کی راہنمائی ان کے مستقر کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں؟ یہ راہنمائی وہی ہے جو خدا کی ''وحی'' نے ان کے اندر رکھ دی ہے۔ **رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی** اسی سلسلہ میں ایک مبصر مسٹر (C.T.Hudson) نے' اپنی کتاب (Brids and Man) میں اس قسم کے مہاجر پرندوں کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ ان مہاجرین کا قافلہ اڑ گیا تو پیچھے دو پرندے رہ گئے ان میں سے ایک زمین پر چلتا تھا اور دوسرا اس سے ذرا آگے فضا میں اڑتا تھا۔ اڑنے والا پرندہ' تھوڑی دور جا کر' پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ چلنے والے پرندے کو آواز دیتا لیکن جب وہ

اپنی رفتار میں تیزی نہ کرتا' تو وہ بھی نیچے اتر آتا تا آنکہ وہ اس کے ساتھ آملتا۔ وہ پھر اڑتا۔۔۔ دونوں اس طرح افتاں وخیزاں' اپنے قافلے کے رخ پر چلتے جاتے۔اس نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نر اور دوسری مادہ ہے۔ مادہ کا ایک بازو حیات ہے۔انسان کا بچہ ہوتا تو وہ اپنی پرشکستہ بیوی کو لات مار کر الگ کر دیتا اور خود دوسری لے آتا۔

کوئی سِلوَٹ یا جھول نہیں

بہرحال' یہ ضمنی بات تھی۔کہا یہ جا رہا تھا کہ کائنات میں ہر شے کو خدا کی طرف سے راہنمائی ملتی ہے اور وہ' بلا چوں چرا' اس راہنمائی کا اتباع کرتی چلی جاتی ہے۔ان میں سے کسی کو اس راہنمائی سے مجال انکار یا' یارائے سرکشی نہیں۔اسی سے یہ عظیم القدر سلسلہ کائنات اس حسن وخوبی سے سرگرمِ عمل ہے کہ اس میں کہیں کوئی سلوٹ کہیں کوئی جھول نہیں آتی۔ **مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ** تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں' کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ **فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ** ذرا نگاہ کو پلٹ کر دیکھو تو سہی۔کیا کہیں کوئی نقص' کوئی شگاف' کوئی عیب نظر آتا ہے؟ **ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ** ایک بار نہیں' عقابِ نگاہ کو بار بار' کائنات کی پہنائیوں میں چھوڑو۔ **یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ** (67:3-4) اسے کہیں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا اور وہ خاسر و نامراد' ہار تھک کر کاشانہ چشم میں لوٹ آئے گی۔

یہ اس لئے کہ ساری کائنات' دین خداندی۔۔۔الاسلام۔۔۔کے مطابق چل رہی ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس میں کوئی خلل' کوئی فساد' کوئی فتنہ' کوئی فتور ہو۔فتنہ وفساد تو غیر اسلامی زندگی میں ہوتا ہے۔اسلامی نہجِ زندگی میں فتنہ وفساد کا کیا کام؟

☆......☆......☆

انسانی دنیا

جب عالمِ موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانونِ زندگی اور ضابطہ حیات متعین ہے' تو کیا انسان جو اس خطہ ارض پر سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی' اور نظم کائنات کا حسین مقطع ہے' اس ضبط و آئین سے مستثنٰی ہو گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام کائنات کے خلاف ہو گا جب کائنات کی ہر شے

ایک نہج واسلوب کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص ضابطۂ حیات کے مطابق دنیا میں رہے۔ یہ طریق حیات اور نہج زندگی وہی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی الاسلام کہہ کر پکارا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ **وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (3:82) انسانوں کے متعلق بھی کہا گیا کہ **بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ** (2:112) اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ **كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ** (2:116) انسانوں سے کہا گیا کہ **قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ** (2:238)

جسمانی زندگی

انسان کی زندگی کے دو حصے، یا دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح وہ ہے جسے طبیعی زندگی Physical Life کہا جاتا ہے۔ یہ اس کے جسم کی زندگی ہے اور اس پر وہی قوانین نافذ ہیں جن کے ماتحت حیوان زندگی بسر کرتے ہیں۔۔ کھانا، پینا، سونا افزائش نسل وغیرہ۔۔۔ پانی جس طرح ایک بیل کی پیاس بجھاتا ہے، اسی طرح انسان کے لئے وجہ تسکین ہوتا ہے۔ اچھی غذا جس طرح ایک گھوڑے کی پرورش کرتی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی فربہی اور تقویت کا موجب بنتی ہے۔ سنکھیا جس طرح ایک کتے کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح انسان کو بھی مار دیتا ہے۔ یہ بھی قوانین خداوندی ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کو طبیعی زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی اس کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے لیکن انسانی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے جو اسے حیوانات سے یکسر الگ اور ممتاز کر دیتی ہے اگر پہلی سطح کی زندگی کو اس کی حیوانی زندگی (Animal Life) کہا جائے تو اس دوسری سطح زندگی کو اس کی ''انسانی زندگی (Human Life) سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس کی حیوانی سطح کا مدار، اس کے طبیعی جسم پر ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کا قیام، اس کی ذات سے وابستہ ہے جسے (Human Personality) کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کے جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول وضوابط متعین ہیں اگر ان اصول وضوابط کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہو جائے تو جسم کی موت کے بعد بھی انسان، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل

ہوجاتا ہے۔ یہ اصول وقوانین جن کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ یہ انسان کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں' لیکن وحی اوراس وحی کے طریق میں بنیادی فرق ہے جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت' اس کا صاحبِ اختیار وارادہ ہونا ہے یہی وہ خصوصیت ہے جس سے انسان' حیوانات سے متمیز ہوتا ہے اور جو اس کے لئے باعثِ صد شرف وافتخار ہے۔ اسی اختیار وارادہ کا نتیجہ ہے کہ انسان کی طرف وحی بھیجنے کا طریق الگ تجویز کیا گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بے جان اشیائے کائنات میں سے ہر شے کے اندر' اور جانداروں کی ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائشی طور پر' وہ راہنمائی رکھ دی گئی ہے جس کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ چیز ان کی جبلت میں داخل ہے اور جبلت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پیروی مجبوراً کی جائے۔ اس سے گریز اور مفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ (انسان کے علاوہ) کائنات کی ہر شے ان قوانین کی اطاعت ازخود کئے جارہی ہے جو اس کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کردیئے گئے ہیں اگر انسانی ذات سے متعلق اصول وقوانین بھی' ہر انسانی بچے کے اندر' پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کردیئے جاتے' تو انسان بھی ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہوجاتا اور یہ چیز اس کے صاحبِ اختیار وارادہ ہونے کے یکسر منافی ہوتی۔ اس کے لئے مشیت نے یہ پروگرام مقرر کیا کہ یہ قوانین' انسانوں میں سے ایک منتخب ہستی کو بذریعہ وحی دیدیئے جاتے' اوراس سے کہہ دیا جاتا کہ وہ انہیں دوسرے انسانوں کے سامنے رکھ دے اوران انسانوں سے کہہ دیا جاتا کہ اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو انہیں اختیار کرلیں اور چاہے تو ان سے انکار کرکے' اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کرلیں لیکن اتنا سمجھ لیں کہ ان قوانین کے اتباع سے انہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہوجائیں گی اوران کی خلاف ورزی کرنے سے وہ تباہ وبرباد ہوجائیں گے۔ مشیت کی اس سکیم کا نتیجہ ہے کہ جہاں، کائنات کی تمام اشیاء' قوانینِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہیں' انسانوں میں سے بعض ان قوانین کو مانتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب' قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ سورج' چاند' ستارے' پہاڑ' درخت اور جاندار لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے' ان میں سے بعض ان قوانین کے سامنے جھکتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ...... (22:18) یہی وجہ ہے کہ جہاں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے)

اختیار و ارادہ

اشیائے کائنات کے متعلق کہا ہے کہ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (3:83) یہ سب طوعاً و کرہاً قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:112) ہاں! جو کوئی ان میں سے اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دے اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے' تو اس کا اجر اس کے نشو و نما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق ملے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ دوسرے مقام پر اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (2:116) سب اس کے قوانین کی اطاعت کرتی ہیں لیکن انسانوں سے کہا گیا کہ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (2:238) تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اسی کو حسین ترین نظامِ زندگی کہا گیا یعنی انسانوں کا برضا و رغبت بطیّب خاطر' اپنے اختیار و ارادہ کو کام میں لا کر' علیٰ وجہ البصیرت' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (4:126) انسانوں کو یہ اختیار' طبیعی دنیا میں بھی حاصل ہے' اور انسانی دنیا میں بھی۔ مثلاً پانی کے لئے قانون یہ مقرر ہے کہ اگر اس پر کوئی خارجی دباؤ نہ ہو تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے زمینیں' ندی کے نشیب کی طرف بھی ہوتی ہیں' فراز کی طرف بھی جو کسان اپنا کھیت نشیب کی طرف بناتا ہے وہ قانون خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔۔۔۔ یا یوں کہئے کہ وہ اپنی کوششوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے۔۔۔ اور اس کا پھل پاتا ہے۔

طبیعی زندگی کے مفاد

یہ قوانین چونکہ انسان کی حیوانی سطح زندگی سے متعلق ہیں' اس لئے یہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو نہ انسانی ذات کو تسلیم کریں نہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھیں۔ نہ مستقل اقدار کو مانیں' اور زندگی صرف اس دنیا کی طبیعی زندگی کو سمجھیں' وہ بھی اگر ان قوانین کی اطاعت کریں' تو انہیں ان کے نتائج اسی طرح ملیں گے جس طرح ان لوگوں کو جو مذکورہ بالا تمام امور پر یقین رکھیں۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو صرف ''حیات الدنیا'' کے ماننے والے اور دوسرے طبقہ کو ''دنیا اور آخرت'' دونوں کے ماننے والے قرار دیا ہے۔ پہلے طبقہ کی ساری کوششیں دنیاوی مفاد کے حصول میں صرف ہو جاتی ہیں اور ان میں انسانی اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ **فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ** (2:200) لوگوں میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ دنیاوی زندگی میں مل جائے۔ ان کا اخروی مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ **وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** ...... (2:201) اور وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں نصیب ہوں اور حیات اخروی کی خوشگواریاں بھی۔ یہ لوگ قرآن کریم کی اصطلاح میں ''مومن'' کہلاتے ہیں۔۔۔ یعنی وہ لوگ جو خدا کے مقرر فرمودہ قوانین طبیعی کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور مستقل اقدار کی نگہداشت بھی۔ ان کے برعکس' جو لوگ صرف قوانین طبیعی کو تسلیم کرتے ہیں اور وحی کی رو سے عطا شدہ' مستقل اقدار کو نہیں مانتے' انہیں کافر۔۔۔ یعنی نہ ماننے والے کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانین طبیعی کا ماننا اور جو ان کے مطابق کوشش کرے گا۔ وہ ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہوگا قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے' جہاں فرمایا **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا** جو کوئی' اس طبیعی زندگی کا مفاد عاجلہ چاہتا ہے' ہم اسے' اپنے قانونِ مشیت کے مطابق یہ مفاد دیدیتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تباہ و برباد ہوتا ہے۔ **وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** اور جو (دنیاوی مفاد کے ساتھ) مستقبل کا مفاد بھی چاہتا

ہے اور اس کے لئے پوری پوری کوشش کرتا ہے اور خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے' تو ان لوگوں کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:18-20) ہم دونوں گروہوں کو' ان کی کوششوں کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری عطا کردہ نعمتوں کا دروازہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ ہم نے ان کے سامنے کوئی بند نہیں لگا دیا کہ فلاں لوگ اس کے اندر آ سکیں گے اور فلاں نہیں۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

مومن اور کافر کا فرق

قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب کو خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تو اس میں خطاب کسی خاص گروہ سے نہیں۔ خطاب تمام انسانوں سے ہے جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے کر' فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لائے گی' وہ ان سے متمتع ہو جائے گی۔ مومن اور کافر کا فرق اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ کافر' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے' انہیں اپنے فیصلوں کے مطابق' صرف کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنم ہے جس میں اس وقت دنیا مبتلا ہے۔ جس قدر فطرت کی قوتوں کی تسخیر بڑھتی جاتی ہے' اسی قدر اس جہنم کی آگ میں وسعت اور شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے لیکن مومن' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے' انہیں خدا کی متعین فرمودہ مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے جس سے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدود اللہ کے اندر رہنا کہا جاتا ہے یعنی اپنی صلاحیتوں اور فطرت کی قوتوں کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے صرف کرنا' جنہیں خدا نے تمام نوع انسان کے عالمگیر مفادِ کلی کو سامنے رکھ کر متعین کیا ہے۔ مثلاً جب ''قومِ کافر'' فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے تو وہ انہیں اپنے مفاد اور دوسری اقوام کی تخریب کے لئے صرف کرتی ہے ------------------- ظاہر ہے کہ جب مختلف اقوام عالم ان

قوتوں کو اپنے اپنے مفاد اور دوسروں کی تخریب کے لئے استعمال کریں گی تو اس سے دنیائے انسانیت میں عالمگیر فساد برپا ہوجائے گا لیکن جب ''قومِ مومن'' ان قوتوں کو مسخر کرے گی تو وہ انہیں تمام نوع انسان کی پرورش اور نشوونما کے لئے صرف کرے گی کیونکہ ربوبیتِ عالمینی ایک مستقل قدر ہے جسے یہ ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکتی یا مثلاً جب ''حکومت'' ''قومِ کافر'' کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرے گی۔ اسے مختلف طبقات میں تقسیم کردے گی جس سے غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ عدل وانصاف مٹ جائے گا اور تمام فیصلے حکمران طبقہ کے مفاد کے ماتحت ہوں گے لیکن جب یہی حکومت قومِ مومن کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرے گی۔ تمام افراد معاشرہ کے لئے سامان زیست اور اسباب نشوونما ضرورت کے مطابق مہیا ہوں گے ہر انسان کی بہ حیثیت انسان عزت وتکریم ہوگی۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا اس میں نہ کسی کی رعایت ہوگی نہ کسی کے خلاف زیادتی۔ اس لئے کہ ان تمام امور کے لئے خدا کی طرف سے دیئے ہوئے اصول وقوانین پر ان کا ایمان ہوگا اور انہی کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کا نصب العینِ حیات۔ اس سے جہاں اس دنیا میں جنتی معاشرہ قائم ہوجائے گا اس کے ساتھ ان کی اپنی ذات کی نشوونما ایسے انداز سے ہوتی جائے گی جس سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی میں ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجائیں گے یعنی یہاں بھی جنت وہاں بھی جنت اس لئے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا راز نوع انسان کی عالمگیر ربوبیت اور نظام عدل واحسان میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کیا ہے؟

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اسلام نام ہے طبیعی دنیا سے متعلق قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اور وحی کی رو سے عطا شدہ مستقل اقدار واصولِ حیات کے مطابق زندگی۔ بالفاظ دیگر فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف میں لانا اسلام ہے۔

اب ہمارے سامنے تین قسم کے گروہ آگئے۔

1- پہلا گروہ ان لوگوں کا جو قوانین فطرت کی متابعت سے (جسے فزیکل سائنس کہتے ہیں)

کائناتی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں لیکن مستقل اقدار پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہیں دنیا کے مادی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے اور جن لوگوں کا یہاں معاشرہ جہنمی ہو' ان کا مستقبل بھی جہنمی ہوتا ہے۔

2- دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو فزیکل سائنس کی رو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ان کی زندگی یہاں بھی جنتی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی۔

3- تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ دنیا' زندگی' ذلت وخواری اور محتاجی وکسمپرسی کی زندگی ہوگی۔ وہ سامانِ زیست تک کے لئے دوسری قوموں کے دست نگر ہوں گے۔

دنیا اور آخرت

اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ گروہ' خدا۔ وحی' آخرت پر ایمان کا مدعی ہو' تو کیا ان کی اخروی زندگی کامیاب وکامران ہو جائے گی؟ اس کا جواب واضح ہے۔ خدا' وحی' آخرت یا مستقل اقدر پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب جو قوم فطرت کی قوتوں سے محروم ہے' اس کے لئے ان قوتوں کے صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا' خدا' وحی' آخرت' مستقل اقدار وغیرہ پر اس کا ایمان محض لفظی دعویٰ ہے جو کبھی عمل میں نہیں آتا وہ اپنے نتائج کیا پیدا کرے گا؟ یہ خیال رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جو انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ اس سے انسان اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ یہاں کی تباہی اور زبوں حالی کا عاقبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ جو یہاں جتنا زیادہ زبوں حال ہوگا وہ عاقبت میں اتنا ہی خوش بخت ہوگا۔ قرآن کریم اس کی کھلے الفاظ میں تردید کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ جس قوم پر اس دنیا میں مادی سامانِ زیست کے دروازے نہیں کھلتے' اس کی عاقبت کبھی سنور نہیں سکتی۔ وہ کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ **وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے یہ یہاں کی بدحالی ہے **وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى** (20:124) اور اسے ہم قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے اس کی وجہ ظاہر ہے۔

قوانین فطرت بھی خدا ہی کے متعین کردہ قوانین ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے، یا ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ان قوانین کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حصے سے انکار کرتے ہیں، تو دوسرے حصے کا زبانی اقرار ہمیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ...... (2:85) جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت وخواری نصیب ہوگی اور وہ قیامت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے سے انکار کرنے اور دوسرے حصے پر ایمان رکھنے کا نتیجہ صرف اسی دنیا کی ذلت وخواری نہیں بلکہ آخرت کی تباہی اور بربادی بھی ہے یہ اس لئے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) دوسرے حصے (یعنی مستقل اقدار) پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اسے پہلے حصے (یعنی دنیاوی معاشرہ) میں عملاً نافذ کیا جائے۔ قرآن کریم کے احکام وقوانین، دنیاوی زندگی کو وحی الٰہی کے مطابق خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ہیں۔ حتیٰ کہ صلوٰۃ جیسی ''عبادت'' بھی اسی حقیقت کی یاد تازہ کرنے اور اس آرزو کو بیدار کرنے کے لئے ہے کہ ہم زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کریں گے۔ ہم اس کے قوانین کے سامنے جھکیں گے۔ لہٰذا، دنیاوی زندگی کو قابل اعتناء نہ سمجھنا اور خیال یہ کرنا کہ ہم قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہے ہیں، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یاد رکھئے! جسے اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل نہیں، یا وہ ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتا وہ قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتا اور اسی لئے اسے دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً مومن کا صحیح شعار زندگی ہے اور جس روش کا نتیجہ یہ نہیں، وہ اسلام نہیں کچھ اور ہے ایمان وعملِ صالح کا لازمی نتیجہ اس زمین کی سرفرازی وسربلندی، حکومت وسطوت ہے (24:55)۔ یہ خدا کا اٹل وعدہ ہے جس کی دنیا خراب ہے اور وہ اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی آخرت بھی تباہ وبرباد ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دین کی غایت

دین اس لئے آتا ہے کہ وہ انسان کے دنیاوی معاملات سنوار دے۔ انہی معاملات کے سنورنے سے' اس کی عاقبت سنورتی ہے۔ جس قوم کے دنیاوی معاملات سنورے ہوئے نہ ہوں' اور وہ عالم انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات کو سنوارنے کی فکر نہ کرے' سمجھ لیجئے کہ اس قوم کی عاقبت سنوری ہوئی نہیں۔ دین ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جو انسانی زندگی میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالئے' یہاں سے وہاں تک ایک سلسلۂ صید و صیاد نظر آئے گا جس میں ہر فرد اور ہر قوم کی کوشش ہو گی کہ وہ دوسرے فرد اور دوسری قوم کو اپنا شکار بنائے۔ اس کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔ قسم قسم کے جال بچھائے جائیں گے۔۔ کوئی ہمرنگ زمین' کوئی مقدس پردوں کی اوٹ میں' ہر طاقتور کمزوروں کا خون چوسے گا۔ ہر زیرک' دوسروں کو بیوقوف بنا کر ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے گا۔ یوں تو ان شکاریوں کی بہت سی قسمیں ہیں' لیکن اگر ان کی اصولی تقسیم کی جائے تو تین بڑی شاخیں ہمارے سامنے آئیں گی۔۔۔ مستبد حکومت۔ باطل مذہبی پیشوائیت اور خون آشام نظام سرمایہ داری۔ دین' ان تینوں لعنتوں کو مٹا کر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور محتاج نہ رہے' وہ ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد وہ کچھ بن سکے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔ غلط معاشرہ میں' جو ہر انسانیت کے کروڑوں غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں' لیکن دین کی رو سے قائم کردہ معاشرہ میں' ایک فرد بھی ایسا نہیں رہتا جس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر' برومند نہ ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو عالم انسانیت میں دین کی رو سے برپا ہوتا ہے۔ وہ پہلے اس معاشرہ کو ایک خطہ زمین میں متشکل کرتا ہے اور پھر اس کے دائرے کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ پوری عالمگیر انسانیت کو اپنے آغوش میں لے لے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے پورے

کے پورے صفحہ ارض سے، سلب ونہب اور ظلم وجور کو مٹا کر، عدل واحسان کا نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ساری نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا کر اسے اخوت کے رشتے میں پرو دیتا ہے۔ یہ ہے دین کا مقصود۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

''نبوتِ محمدؐیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوتِ محمدؐیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا، بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ بنی انسان کو، باوجود شعوب وقبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، انہیں ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، قوم، نسل، نسب ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحاظ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدیؐ یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا''۔ (مولانا حسین احمدؒ مدنی مرحوم کے نام)

اسلامی معاشرہ

یہ تھا وہ اسلام جسے نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنے بے مثال عمل سے، اسے متشکل کر کے دکھا دیا۔ اس ''بے مثال عمل'' کا مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ اس دین کو لوگوں کے سامنے علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتے تھے اس کی غایت اور حکمت کو دلائل وبراہین سے سمجھاتے تھے۔ مخالفین کے اعتراضات کا علم ودانش کی رو سے جواب دیتے تھے۔ انہیں اس پر تدبر وتفکر کی رو سے غور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس طرح دل ودماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اسے بطیّب خاطر قبول کرتا تھا اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ تھی وہ جماعت جس نے دین کا معاشرہ متشکل کیا اس جدید معاشرہ نے چند دنوں میں ایسے انسانیت ساز درخشندہ نتائج پیدا کیے جو اس کی صداقت کا زندہ ثبوت بنتے چلے گئے۔ اس طرح اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اور دنیا نے ایک ایسا نظام دیکھ لیا جس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم تھا نہ محتاج۔ ہر فرد قوانین خداوندی کے حدود کے اندر رہتے ہوئے، سرفرازی اور آزادی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہی وہ آزادی ہے جس سے اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز سے ہو جاتی تھی کہ وہ، اس زندگی سے اگلی زندگی

کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ اسی کو عاقت سنورنا کہتے ہیں۔ دین کے اس نظام میں، نہ ملوکیت کا کوئی تصور تھا نہ سرمایہ داری کا۔ نہ خانقاہیت کا کوئی دخل تھا نہ مذہبی پیشوائیت کا۔ احترام آدمیت اس کا شعار تھا اور شرف انسانیت، سوسائٹی میں مدارج کا معیار۔ اس میں، (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) بڑے سے بڑا طاقتور کمزور ترین انسان تھا جب تک اس سے مظلوم کا حق نہ دلوا دیا جائے اور کمزور سے کمزور انسان سب سے زیادہ طاقتور تھا جب تک اس کا چھنا ہوا حق اسے واپس نہ مل جائے۔

بعد کا اسلام

یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے بطور نظام حیات تجویز کیا تھا لیکن اس کے بعد اس قوم نے، اس اسلام کی ایک ایک شق کو پس پشت ڈال دیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے لے لی، جس میں ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت، پیشوائیت، غرضیکہ وہ تمام عناصر ایک ایک کر کے آ گئے جنہیں اسلام نے آ کر مٹایا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس قوم میں یہ عجیب انقلاب آیا کہ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

ان کے دنیاوی معاملات، ارباب حکومت نے اپنے زیر اقتدار لے لئے اور مذہب نام رہ گیا چند نظری عقائد اور بے جان رسومات کے مجموعہ کا۔ معتقدات میں اس قسم کی بحثیں شروع ہو گئیں (اور ان کے اختلاف پر خون کی ندیاں بہنے لگ گئیں) کہ آدم کی روح درحقیقت خدا کی روح ہے یا اس سے الگ ہے۔ خدا کی صفات قدیم ہیں یا حادث۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ خدا اپنی معلومات کے خلاف بھی ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ انسان اپنے اعمال کے آپ خالق ہیں یا نہیں۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ اہل جنت کو خدا کا دیدار ہوگا یا نہیں کیا خدا کو اس کی قدرت ہے یا نہیں کہ اہل بہشت کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے عذاب میں کمی بیشی کر سکے۔ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں۔ عذاب وثواب کا دیا جانا خدا کی مرضی پر ہے یا انسان اپنے عمل سے اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ حوض کوثر کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے، جنت کے آبخوروں کی ضخامت کتنی بڑی اور وہاں کے انگوروں کا

خوشہ کتنا بڑا ہے۔ یہ معتقدات کی بحثیں تھی۔ مسائل اس قسم کے داخل تعلیم ہو گئے کہ مسواک مٹھی بھر پکڑنے سے بواسیر ہو جاتی ہے۔ مسواک کو چوسنے سے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ ذہ در ذہ حوض میں آدمی کا پیشاب پڑ جائے تو وہ پاک رہتا ہے۔ کنویں میں چوہے کی دم کٹ کر گر جائے تو اس کا پانی کس قدر نکالنا چاہئے' چوہے کا پیشاب پاک ہے یا نہیں۔ سؤر اگر نمک سار میں گر کر نمک بن جائے تو اسے کھالینا چاہئے یا نہیں۔ لونڈی کا دودھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

یا اس قسم کے مسائل کہ غسل' پانی کے کتنے لوٹوں سے کرنا چاہئے۔ سر کے مسح میں ہاتھ کہاں تک پہنچنے چاہئیں اگر قرأت میں ض اور ظ۔ ص اور س۔ ط اور ت میں فرق نہ کیا جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں۔ وغیرہ

ابلیس کی مجلس شوریٰ

یہ ہیں وہ معتقدات' نظریات اور مہماتِ مسائل جن کے حل کرنے میں قوم کی ساری توانائیاں' وقت اور روپیہ صرف ہونے لگا..... آج تک امت انہی مباحث میں الجھے چلی آ رہی ہے۔ اور اس کا نام دین کی خدمت اور جہاد عظیم قرار پا چکا ہے' علامہ اقبال نے اپنی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' میں (جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) ابلیس کی مجلس شوریٰ کے عنوان سے ایک طویل' لیکن بڑی دلچسپ اور پر معنی نظم لکھی ہے جس میں قوم کی اس حالت پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں۔ ابلیس اپنے تمام مشیروں کو جمع کر کے ایک کانفرنس منعقد کرتا ہے تاکہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ ابلیسی پروگرام کو کس گوشے کی طرف سے سب سے زیادہ خطرہ ہے اور اس خطرہ کی روک تھام کس طرح کی جائے۔ لمبی چوڑی بحث کے بعد' ابلیس اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ:۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس کے بعد وہ اپنا مطلب ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں

بے یدبیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

وہ شرعِ پیغمبر جو ہر طاغوتی قوت کے لئے سامانِ موت ہے:۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن۔ مرد آزما۔ مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں

اس کے بعد وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

مشیروں نے پوچھا کہ اس کے لئے ہمیں کرنا کیا چاہئے! اس نے کہا کہ اس کا علاج بہت سہل ہے۔ تم اس قوم کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں

یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تابساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

☆......☆......☆

برادرانِ عزیز! ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسولؐ اللہ والذین معہٗ ' نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوام عالم کی امامت ہمارے حصے میں آ گئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے۔ جس سے ہمارا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و نباتات و جمادات

لیکن وہ اسلام جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، ہمارے پاس آج بھی خدا کی زندہ پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟

والسلام
پرویز

☆......☆......☆

روٹی کا مسئلہ

انسان کے ساتھ یومِ ازل سے چلا آرہا ہے، لیکن ہمارے زمانے میں اس نے خاص اہمیت
حاصل کرلی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری انسانیت کے لیے تپ دِق ثابت ہوا،
اور کمیونزم یا سوشلزم کا نظام، سرسام نکلا۔

اِس مسئلہ کا اطمینان بخش اور انسانیت ساز حل قرآنِ کریم کے معاشی نظام میں ملے گا

یہ نظام کیا ہے؟ اسے پرویز صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب

نظامِ ربوبیت

میں پیش کیا ہے جس نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ بڑی تقطیع کے سوا چار سو صفحات پر
پھیلی ہوئی مطلا اور مجلد کتاب ———— قیمت:

وہ کون سا دماغ ہے ——

جس میں —— اِس قِسم کے سوالات نہیں اُبھرتے کہ:

- ○ کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے؟ ○ کیا سب کچھ خُدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- ○ کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عُمر دھکے کھاتے رہیں؟ ○ کیا خُدا کو ایسا ہی منظور ہے؟
- ○ کیا موت کا ایک دن مقرر ہے یا وہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہے؟
- ○ بعض بچے پیدائشی اندھے، لولے، لنگڑے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- ○ اگر خُدا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا؟
- ○ کیا دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اگر نہیں بدلتی تو ہم دُعا کیوں کرتے ہیں؟

یہ، اور اِسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق **مسئلۂ تقدیر** سے ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے **کارل مارکس** نے کہہ دیا کہ:

مذہب عوام کے لیے افیون ہے

جناب **پرویز** نے —— دُنیا کے اِس مُشکل ترین مسئلہ کو —— اپنی تصنیف

کتاب التقدیر

میں، قرآنِ کریم کی روشنی میں، اس عمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔

کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زاید صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ جلد مضبوط —— اور گرد پوش جاذب نگاہ (نقشِ ثانی) —— قیمت:

مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ
نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔
یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے
اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں
غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر
میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ
قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں
سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی
نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)

قرآنی پمفلٹس

صحیح قرآنی فکر کو عام لوگوں تک پہنچانے میں قرآنی فکر پر لکھے گئے چھوٹے پمفلٹس نے بھی بہت ہی اہم اور کامیاب کردار ادا کیا ہے۔ احباب اِن پمفلٹس کا خود بھی مطالعہ کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو تقسیم بھی کرتے ہیں اس لئے اِن کی قیمت اصل لاگت سے بہت ہی کم رکھی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ صاحب ثروت احباب اِس کمی کو اپنے عطیات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ یہ سلسلہ ابھی بھی محدود پیمانے پر جاری ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اِس سلسلہ کو مزید بہتر کیا جائے لہٰذا صاحب ثروت حضرات سے مزید عطیات کی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ قرآنی فکر کے کام میں مزید وسعت پیدا کرنے میں ہماری مدد کریں اور اپنے عطیات ''پمفلٹس فنڈ'' کے لئے بھجوائیں تاکہ پمفلٹس کی طباعت اور دوسروں تک قرآنی فکر کو پہنچانے میں ہم کامیابی حاصل کرسکیں۔

یہ یاد رہے کہ ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ بنام ادارہ طلوع اسلام B-25 گلبرگ 2 'لاہور ارسال فرمائیں۔
بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465 نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ' لاہور۔

(دستیاب پمفلٹس کی لسٹ اندرونی ٹائٹل کے پہلے اور آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔